بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اب سوال کے دوسرے حصہ پر غور کیجیے۔ یعنی اس مسئلہ پر کہ شروع شروع میں انبیائے کرام علیہم السلام کس طرح مخاطب کرتے ہیں؟ یہ ظاہر ہے کہ انبیاء کی بعثت ہوتی ہی اس زمانہ میں ہے جبکہ حق و باطل میں امتیاز، وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر ناممکن ہو جاتا ہے اور عملاً تمام نظام زندگی حق کی جگہ باطل کے قبضہ میں آجاتا ہے۔ ایسے زمانہ میں حق صرف نبی کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ اس کے دائرہ سے باہر حق کے کچھ اجزاء تو پائے جا سکتے ہیں لیکن پورے حق کا پایا جانا ناممکن ہے۔ اس وجہ سے اگر انبیائے کرام ابتدا ہی میں لوگوں کو اس طرح مخاطب کریں کہ اے کافرو، ایمان لاؤ! اے مشرکو، توحید اختیار کرو! یا زیادہ سے زیادہ رعایت دے کر یوں کہیں کہ اے منافقو، اخلاص اختیار کرو! تو صورت واقعہ کے اعتبار سے ان کا یوں دعوت دینا بیجا نہیں ہو سکتا کیونکہ واقعہ یہی ہے کہ ان کے دائرہ سے باہر جو کچھ ہے وہ صرف کفر و شرک اور نفاق ہی ہے لیکن جن لوگوں نے حضرات انبیائے کرام کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ وہ لوگوں کو اے انسانو، اے لوگو، اے میری قوم، اے اہل کتاب، اے وہ لوگو جو یہودی ہوئے، اے وہ لوگو جو نصرانی ہوئے، اے وہ لوگو جو ایمان لائے، وغیرہ الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں اور ان کا یہی طرز خطاب اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک قوم ان کو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی اور حق دشمنی سے اس قدر مایوس نہ کر دے کہ ان کے لیے قوم سے علیحدگی اور ہجرت کا وقت آجائے۔ جب قوم اپنی حق دشمنی میں اس قدر آگے بڑھ جاتی ہے کہ اہل حق کا وجود اس کو اپنے اندر کسی طرح گوارا نہیں ہوتا اور تائید حق کی بڑی سے بڑی دلیل بھی بیکار ہو کے رہ جاتی ہے اس وقت انبیاء اپنی قوم کو چھوڑتے ہیں اور یہی وقت ہوتا ہے کہ وہ صاف صاف الفاظ میں ان لوگوں کے لیے

کافر و شرک وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو اپنے کفر و شرک پر اڑے رہتے ہیں۔

یوں تو یہ حقیقت ہر نبی کی دعوت میں واضح ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آنحضرت صلعم کی دعوت کے مختلف مدارج پر جس شخص کی نظر ہوگی وہ اس حقیقت کا کسی طرح انکار نہیں کر سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو، اپنی قوم کو اور اپنے عہد کے بادشاہ کو جن الفاظ سے خطاب کیا ہے ان میں کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ مخاطب کو ایک کافر و شرک کی حیثیت سے مخاطب کر رہے ہیں لیکن جب دعوت و تبلیغ پر ایک مدت گزر گئی اور دلائل و معجزات کی ساری قوت قوم کی ضد کے مقابل میں نہ صرف بے اثر رہی بلکہ یہ ضد اس قدر بڑھ گئی کہ پوری قوم ان کی جان کے در پے ہو گئی اس وقت انھوں نے قوم سے علیحدگی کا اعلان کیا اور جن الفاظ میں کیا ہے ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے شرک و کفر کے ساتھ رواداری کی جو آخری حد ہو سکتی ہے وہ ختم ہو گئی اور اب صرف یہ کہ وہ ان کے کفر و شرک کا اعلان کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اپنی نفرت و عداوت کا بھی اعلان کرنا چاہتے ہیں۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ

تمھارے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان چیزوں سے جن کی تم اللہ کے سوا پوجا کرتے ہو، بالکل بری ہیں۔ ہم نے تمھارا انکار کیا اور ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت و نفرت کا اعلان ہو گیا

ٹھیک یہی حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا ہے۔ قرب ہجرت سے پہلے کی کسی سورہ میں بھی یہ بات نہیں مل سکتی کہ آپ نے اپنی قوم کو یا اہل کتاب کو کافر و مشرک یا منافق وغیرہ کے الفاظ سے مخاطب کیا ہو۔ بالکل ابتدائی سورتوں میں زیادہ تر خطاب یا ایھا الانسان کے الفاظ سے ہے یا یا ایھا الناس یا یٰقوم کے الفاظ ہیں۔ اسی طرح اہل کتاب کے لیے یا اھل الکتاب کے یا اس کے ہم معنی الفاظ ہیں۔ یہاں تک کہ منافقین کے لیے بھی فتح مکہ کے بعد تک وہی عام لفظ یا ایھا الذین آمنوا کا استعمال ہوتا رہا اور صراحت کے ساتھ ان کو اے منافقو

کے الفاظ سے کہیں خطاب نہیں کیا گیا۔ لیکن جب ایک مدت کی دعوت و تبلیغ کے بعد قوم پر اللہ کی حجت پوری ہوگئی اور نہ ماننے والوں نے نہ صرف یہ کہ مانا نہیں بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کرلیا اس وقت آپ نے ہجرت فرمائی اور کفار قریش کو صاف صاف۔ اے کافرو کے الفاظ سے مخاطب کیا اور ان سے اور ان کے دین سے اپنی علیحدگی کا اعلان کیا۔

قُلْ یٰاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۔ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۔ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۔ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۔ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۔ لَكُمْ دِیْنُكُمْ وَلِیَ دِیْنِ

کہہ، اے کافرو نہیں پوجتا ہوں جسے تم لوگ پوجتے ہو، اور نہ تم پوجتے ہو جسے میں پوجتا ہوں اور نہ میں پوجنے کا جسے تم لوگ پوجتے آئے اور نہ تم لوگ پوجنے کے جسے میں پوجتا ہوں، تمھیں تمھارا دین اور مجھے میرا دین!

یہ ساری احتیاط صرف لوگوں کو کافر و مشرک نہ قرار دینے کے حد تک تھی۔ لوگوں کے کافرانہ اور مشرکانہ اعمال کو کفر و شرک قرار دینے میں انبیائے کرام نے کبھی معمولی رعایت بھی نہیں فرمائی بلکہ اگر کبھی ان کے دل میں مخاطب کے لیے کسی رواداری کا کوئی وسوسہ پیدا ہوا یا مخالف حالات کی وجہ سے ان کو کوئی تردد لاحق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو مضبوط کیا اور کفر کو کفر اور شرک کو شرک ثابت کرنے میں ان کو سخت سے سخت تر کردیا۔ اس کا سبب العیاذ باللہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ لوگوں کو کافر و مشرک قرار دینا چاہتے ہوں لیکن محض فتنہ کے اندیشہ یا اس خیال سے کہ لوگ دعوت سے بدک جائیں گے ایسا کرنے سے احتراز کرتے ہوں کیونکہ اگر اس طرح کی مصلحت پرستی ان کے ہاں جائز ہوتی تو کفار جس طرح کے سمجھوتہ کی تجویزیں پیش کرتے تھے وہ بڑی آسانی سے ان کو منظور کرکے سارا جھگڑا ختم کر دے سکتے تھے لیکن معلوم ہے کہ اس دعوتِ حق کے بارہ میں انھوں نے نہ تو کبھی کسی رواداری کی گنجائش رکھی نہ کبھی لومۃ لائم کی پروا کی۔ اس وجہ سے یہ سوال قابل غور ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ کفر و شرک کو کفر و شرک قرار دینے کے باوجود انھوں نے کفر و شرک کے مرتکبین کو کافر و مشرک قرار دینے میں اتنی احتیاط کی اور ان سے براءت اور علیحدگی کے

اعلان میں اتنی دیر لگائی؟

ہمارے لیے اس سوال پر غور کرنا اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ جن چیزوں کو قرآن یا حدیث صحیح میں کفر و شرک کہا گیا ہے، ہم عام علماء کی طرح فضول قسم کی تاویلیں کر کے، ان کو ایمان و توحید ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اللہ اور رسول نے جس چیز کو شرک اور کفر کہا ہے، اس کو کفر و شرک قرار دیتے ہیں اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کرتے کہ اس سے اپنا پندار ایمان مجروح ہو رہا ہے یا دوسروں کے کبر نفس پر ضرب پڑ رہی ہے۔ ہمارے اس رویہ سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ جب ہم فلاں فلاں اعمال یا عقائد کو کفر و شرک قرار دیتے ہیں تو لازماً ان لوگوں کو کافر و مشرک بھی قرار دیتے ہیں جو ان اعمال و عقائد میں مبتلا ہیں اور چونکہ بدقسمتی سے اس زمانہ میں مسلمان عام طور پر ان اعمال و عقائد کے مرتکب ہیں اس وجہ سے ہم پر یہ الزام تھوپ دیا جاتا ہے کہ ہم مسلمانوں کے سواد اعظم کی تکفیر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک دوسرا گروہ ہم پر مداہنت اور خوف خلق کا الزام لگاتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ جب تم تسلیم کرتے ہو کہ فلاں فلاں اعمال و عقائد کفر و شرک ہیں تو جو لوگ آج ان کے مرتکب ہیں ان کی تکفیر کیوں نہیں کرتے اور ان سے برأت کا اعلان کیوں نہیں کرتے؟ ان دونوں جماعتوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اوپر کے سوال پر غور کیا جائے۔

ہمارے نزدیک انبیائے کرام علیہم السلام اعمال کفر و شرک کو کفر و شرک قرار دینے کے باوجود ان کے مرتکبین کو کافر و مشرک قرار دینے اور ان سے اعلان برأت میں جو دیر لگاتے ہیں اس کی دو نہایت اہم وجہیں ہیں۔

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بندوں کو جو کچھ سرزنش و ملامت ہے وہ اتمام حجت اور تبلیغ کامل کے بعد ہے۔ اگر اتمام حجت اور تبلیغ کے بغیر لوگوں پر گرفت یا ان سے اظہار بیزاری جائز ہوتی تو اللہ تعالیٰ انبیاء کو نہ مبعوث فرماتا۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ انبیائے کرام لوگوں کو کافر قرار دینے اور ان سے اعلان برأت کرنے سے پہلے ان کو اتنا موقع دیں کہ ان پر اللہ تعالے کی حجت پوری ہو جائے اور ان کے

انکار کے لیے ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی اور وجہ باقی نہ رہ جائے۔ یہ کام ایک مدت کی تبلیغ و تعلیم کا محتاج ہے۔ انبیاء کے فترہ کے زمانہ میں جو تاریکی چھا جاتی ہے وہ اتنی سخت ہوتی ہے کہ اس کے اندر خواص کو بھی راہِ حق سجھائی نہیں دیتی چہ جائیکہ عوام کالانعام۔ اس وجہ سے ہر گروہ اس بات کا محتاج ہوجاتا ہے کہ اس کو بار بار تذکیر و تبلیغ کی جائے اور چونکہ غلطیاں اور گمراہیاں روایت بن کر دلوں میں رچ بس جاتی ہیں اور ان کے ساتھ لوگوں کے اغراض وابستہ ہوجاتے ہیں اس وجہ سے اس بات کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے مٹانے کے لیے ایک مدت تک جہاد کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام دیر طلب ہے اس وجہ سے حضرات انبیاء پورے صبر و استقلال کے ساتھ ایک لمبی مدت تک اس کام میں صرف کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ حق اس قدر واضح ہوجاتا ہے کہ ان لوگوں کے سوا جن کے باطل کے ساتھ اغراض وابستہ ہوتے ہیں کوئی اور اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ جب حق تبلیغ اس حد تک پورا ہوجاتا ہے تب انبیاء کے لیے یہ بات جائز ہوتی ہے کہ وہ منکرین کے کفر و شرک کا اعلان کر کے ان سے علیحدہ ہوجائیں۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ جب پوری سوسائٹی کا نظام حق کی جگہ باطل کی بنیاد پر قائم ہو کر چلنے لگتا ہے تو ان لوگوں کے لیے بھی حق کی پیروی ناممکن ہوجاتی ہے جو حق کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت زندگی کے ہر گوشہ میں فساد اس طرح گھس جاتا ہے کہ کسی محتاط سے محتاط آدمی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ فساد کے کچھ جراثیم نگلے بغیر سانس لے سکے۔ ایسی صورت میں اگر اس مجبوری کا لحاظ کیے بغیر انبیاء کرام لوگوں پر کفر و شرک کے فتوے جڑ کر ان سے براءت کا اعلان کر دیں تو یہ بہتوں پر نہایت شدید ظلم ہوگا۔ اس وجہ سے وہ تکفیر اور اعلان براءت سے اپنا کام شروع کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی تبلیغ و دعوت سے ایسا ماحول پیدا ہو کہ اس کے اندر اہل حق اپنے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ یہ ماحول جب پیدا ہونے لگتا ہے اور زندگی کی وہ راہ کھل جاتی ہے جس پر حق پرست چل سکتے ہیں اگرچہ وہ تنگ اور دشوار گذار ہی ہو تب وقت آتا ہے کہ جو لوگ اس کو چھوڑ کر محض اپنی تن پروری اور جھوٹی نمائشوں کی خاطر باطل کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں ان کے کفر کا بھی اعلان کر دیا جائے اور ان سے علیحدگی بھی اختیار کرلی جائے۔

حضرات انبیائے کرام کا اسوۂ حسنہ یہی ہے۔ اگر ہم اس سے موجودہ حالات میں رہنمائی حاصل کریں تو یہ امر بالکل واضح ہے کہ اس وقت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں جو حالات ہیں وہ بہت سے اعتبارات سے انبیاء کے فترہ کے زمانہ سے اشبہ ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب آج بے کم و کاست ہمارے اندر موجود ہے اس وجہ سے اس وقت دنیا کسی نبی کی ہدایت کی محتاج نہیں ہے اور نہ اب قیامت تک کسی نبی کی محتاج ہو گی لیکن ہدایت خلق اور مسلمانوں کو حق پر استوار رکھنے کے لیے ہمارا شرعی نظام خلافت کا نظام تھا جو ایک مدت سے درہم برہم ہو چکا ہے اس وجہ سے اس وقت مسلمان یا دنیا کے دوسرے انسان جن خرابیوں اور گمراہیوں میں مبتلا ہو چکے ہیں ان میں مبتلا ہونے پر وہ سزا کے نہیں بلکہ رحم کے مستحق ہیں۔ ہم اس مضمون کی پچھلی قسطوں میں اس بات کو وضاحت کے ساتھ لکھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کے لیے اب دنیا پر اتمام حجت کا فرض اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ڈالا ہے اور اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کی بتائی ہوئی صورت یہ ہے کہ مسلمان خلافت کا نظام قائم کریں جو ایک طرف دنیا کو نیکی اور بھلائی کے راستہ کی دعوت دے دوسری طرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ سے مسلمانوں کو صراط مستقیم پر قائم رکھے۔ خلافت کا نظام قائم نہ رہنے کی وجہ سے ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی پوری نہیں ہو رہی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات پوری نہیں ہو رہی ہے بلکہ عملاً ساری دنیا ایک باطل نظام کی گرفت میں آ چکی ہے۔ اور باطل ایسی قوت و شوکت کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے کہ حق کے لیے موجودہ نظام زندگی میں کوئی جگہ ہی سرے سے باقی نہیں رہی ہے۔ نظام تعلیم، نظام تمدن، نظام معاشرت، نظام سیاست ہر چیز حق سے منحرف اور باطل کی مددگار ہے یہاں تک کہ اس کے زیر سایہ اگر کوئی چھوٹا بڑا کام دین کے نام سے کیا بھی جا رہا ہے تو وہ بھی وقت کی فضا کی ناسازگاری کی وجہ سے باطل ہی کو تقویت پہنچاتا ہے۔ نیک سے نیک انسان، جو فی الحقیقت نیکی اور سچائی کے راستہ ہی پر چلنا چاہتا ہے، آج چند قدم بھی بغیر مزاحمت کے نہیں اٹھا سکتا۔ اگر دور والے اسے تھوڑی دیر کے لیے بخش دیں تو قریب والے ہی اس سے الجھتے ہیں اور کسی طرح نہیں چاہتے کہ وہ اپنی منتخب کی ہوئی راہ میں دو قدم بھی آگے بڑھ سکے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا

کہ "بدی کی راہ فراخ ہے اور اس پر چلنے والے بہت ہیں اور نیکی کی راہ تنگ ہے اور اس کے چلنے والے تھوڑے ہیں"۔ یہ چیز آج آنکھوں سے مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ باطل کی منزل پر پہنچنے کے لیے فراخ سڑکیں ہیں، دو رویہ درختوں کا سایہ ہے، تیز رو سواریاں ہیں، حفاظت کے لیے بدرقہ ہے، ہر منزل پر عیش و آرام ہے۔ آپ جب وقت چاہیں اس پر سفر کر کے منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس حق کی راہ پہلے ہی قدم پر رُندھی ہوئی ہے۔ اگر آپ ہمت کر کے اس مزاحمت کو دور کر سکے تو آگے کی راہ میں ہر قدم پر خطرہ ہے یہاں تک کہ شروع سے لے کر آخر منزل تک خطرہ کے سوا کچھ ہے ہی نہیں اور کوئی شخص اس راہ میں آج سر لیے ہوئے پاؤں رکھ ہی نہیں سکتا۔ ایسے نازک اور پر آشوب زمانہ میں یہ بات ذرا تعجب انگیز نہیں ہے کہ لوگ راہ سے بے راہ ہو گئے۔ تعجب انگیز اگر کوئی بات ہو سکتی ہے تو یہ ہو سکتی ہے کہ گمراہی کے اتنے سامان مہیا ہونے اور شیطان کے ایسے عالمگیر تسلط کے باوجود، خدا کے کچھ بندوں کو اللہ کا نام یاد کیسے رہ گیا! یہ بیچارے داد کے مستحق ہیں نہ کہ ملامت کے، اور سینہ سے لگا لیے جانے کے لائق ہیں نہ کہ کاٹ پھینکے جانے کے۔ جن لوگوں نے اتنے نامساعد حالات کے اندر اپنی شمع ایمان زندہ رکھی اگرچہ وہ کتنی مضمحل حالت میں سہی، وہ اپنے پاس اس بات کی سند رکھتے ہیں کہ اگر ان کو موافق حالات میسر آتے تو وہ بہتر سے بہتر مسلمان ہوتے۔ اس وجہ سے ان کی غلطیوں اور غیر شعوری گمراہیوں یا اضطراری ضلالتوں کی بنا پر ان کو ایمان سے محروم قرار دے کر ان سے نفرت کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان میں ایمان و اسلام کے صحیح مقتضیات کا شعور بیدار ہو۔

یہ سلوک تو ہمارا ان لوگوں کے ساتھ ہونا چاہیے جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں، عام اس سے کہ اسلام کے ساتھ ان کی وابستگی حقیقی ہے یا ظاہر وارانہ۔ باقی رہیں غیر مسلم قومیں تو انصاف یہ ہے کہ ان کے بارہ میں بھی، اگر اپنی ذمہ داریوں کا ہمیں ٹھیک ٹھیک احساس ہو، تو تبلیغ اور اتمام حجت سے پہلے ہم کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم ان کو کافر سمجھیں یا کافر قرار دے کر ان سے بیزاری اور علیحدگی کا اعلان کریں۔ تبلیغ و اتمام حجت کے متعلق ہم اس سلسلہ کی کسی پچھلی قسط میں لکھ چکے ہیں کہ اس کے لیے مجرد یہ بات کافی نہیں ہے کہ دنیا میں مسلمان نامی ایک بُرا بھلا گروہ موجود ہے اور وہ کچھ اُلٹی سیدھی تدبیریں تبلیغ کے لیے کرتا ہے بلکہ اس کے خاص شرائط ہیں اور جب تک وہ اپنے تمام شرائط کے ساتھ پوری نہ کی جائے اس وقت تک اصلی الزام ان لوگوں پر نہیں ہے جو گمراہ ہیں، بلکہ ان لوگوں پر ہے جو گمراہوں کو ہدایت کا راستہ بتانے پر مامور تھے مگر انھوں نے اپنا فرض ادا نہیں کیا۔ ان لوگوں کے بارہ میں اگر ہم ٹھیک ٹھیک وہ روش اختیار کریں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائی تو ہمارا فرض یہ ہوگا کہ ان میں سے جو اہل کتاب ہیں ان پر اس طرح حجت قائم کریں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب پر حجت قائم کی اور جو اہل کتاب نہیں ہیں ان کو انسانیت اور فطرت کے

ان مبادی کی اساس پر دعوت دیں جو ہمارے اور ان کے بلکہ تمام بنی نوع آدم کے درمیان مشترک ہیں۔ اس تبلیغ کو ایک مدت تک جاری رہنا چاہیے۔ اتنی مدت تک کہ جن کے اندر قبول حق کی کچھ بھی صلاحیت ہے وہ حق کی طرف کھنچ آئیں اور اہل باطل اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دیں کہ ان کا باطل میں پڑے رہنا کسی واقعی غلط فہمی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ سرتاسر شرارت اور بدنفسی کا نتیجہ ہے اس کے بعد بلاشبہ اہل حق کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ایسے شریروں کے کافر ہونے کا فیصلہ کریں اور ان سے اعلان برأت کر دیں۔ یہ جہاد کبیر انجام دیے بغیر جو حضرات ساری دنیا کے کفر کا فیصلہ کیے بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آج اگر کسی طرح ان کے ہاتھوں میں طاقت منتقل ہو جائے تو ان کو حق ہوگا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو قرآن نے کافروں اور مشرکوں کے ساتھ کرنے کا حکم دیا ہے، وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور اس غلط فہمی میں شاید وہ اس وجہ سے پڑے رہنا چاہتے ہیں کہ اپنی ذمہ داریوں سے فرار کی یہ نہایت اچھی راہ ہے۔

بہرحال اگر آج انبیاء کے طریقہ پر کوئی دعوت حق بلند ہوتی ہے تو وہ نہ تو اس مفروضہ سے شروع ہو سکتی ہے کہ دنیا میں چالیس کروڑ مسلمان ہیں، یہ تعداد بڑھا کر پچاس یا ۶۰ کروڑ تک پہنچائی ہے، اور نہ اس مفروضہ سے شروع ہو سکتی ہے کہ داعیوں کی مختصر سی جماعت کے سوا باقی دنیا سب کافر و مشرک ہے اور ان کے ساتھ وہی معاملہ روا ہے جو قرآن و حدیث میں کافروں اور مشرکوں کے ساتھ کرنے کے لیے بتایا گیا ہے بلکہ وہ اس نقطہ سے شروع ہوگی کہ ایک مدت سے دنیا میں دعوت حق کا کاروبار معطل ہے اس وجہ سے ایک طرف تو وہ گروہ بے شمار عملی و اعتقادی گمراہیوں میں مبتلا ہو گیا ہے جو اللہ کی طرف سے ہدایت خلق پر مامور کیا گیا تھا اور دوسری طرف جو قومیں تبلیغ و دعوت کی محتاج تھیں اس چیز کے نہ ہونے کی وجہ سے نہ قرآن کے اچھوں کو ان کے بروں سے علیحدہ ہی کیا جا سکا اور نہ ان کے بروں پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہی پوری کی جا سکی۔ اس جذبہ اور اس احساس ذمہ داری کے ساتھ جو تبلیغ ہوگی نہ تو اس میں خود پرستی کا گھمنڈ ہوگا اور نہ دوسروں کی تحقیر و تکفیر کی کوئی گنجائش ہوگی بلکہ ہر شخص اپنی ذمہ داری کے احساس سے گرانبار ہوگا اس وجہ سے یہ مسلموں اور غیر مسلموں دونوں کو اپیل کرے گی۔ اور اگر یہ کام صحیح طریق پر اپنے تمام شرائط کے ساتھ جاری رہا تو وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے تمام صالحین کو چھانٹ کر ایک مرکز پر جمع کر دے گا اور حق و باطل میں نہ صرف امتیاز کرنا بلکہ حق کے راستہ پر چل کر زندگی بسر کرنا بھی ہر شخص کے لیے آسان ہو جائے گا۔ اس وقت بلاشبہ اللہ کی حجت ہر شخص پر پوری ہو جائے گی اور جو لوگ حق کی اس وضاحت کے بعد بھی نظام کفر ہی کے ساتھ چمٹے رہنا چاہیں گے، نہ صرف ان کے کفر کا فیصلہ ہو جائے گا بلکہ اہل حق کے لیے یہ بات بھی جائز ہوگی کہ وہ حق کے دشمنوں سے

اپنے ہر قسم کے دوستانہ روابط قطع کر لیں یہاں تک کہ وہ ان لوگوں کو بھی کوئی مہلت نہ دیں جن میں حق دشمنی کا جذبہ ہے۔ اگر خود ان کے اندر ابھریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باطل پر جینے کی مہلت آدمی کو اس وقت تک ملنی چاہیے جب تک اس کے سامنے حق واضح نہیں ہو سکا ہے یا نظام حق کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس کے لیے پورے حق پر چلنا ممکن نہیں ہے لیکن جب یہ دونوں عذر ختم ہو جائیں یعنی راہ حق واضح بھی ہو جائے اور چلنے والے قافلے اس پر چل کر منزل مقصود تک پہنچ بھی سکیں تو باطل پر جمے رہنے دینے کے لیے نہ کوئی عقلی وجہ ہو سکتی نہ اخلاقی۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ آج جو لوگ دعوت دین کی تجدید کے لیے اٹھیں گے وہ اگرچہ ہر اس بات کو جو کفر و شرک ہے کفر و شرک ہی کہیں گے اور لوگوں کے اعمال و عقائد میں جہاں ان کا کوئی شائبہ موجود ہوگا بے دھڑک اس کی نشاندہی بھی کریں گے لیکن اس کے باوجود ان کو کافر و مشرک نہیں سمجھیں گے، نہ کافر و مشرک کہیں گے اور نہ کافر و مشرک قرار دے کر ان سے برأت کا اعلان کریں گے۔ یہ تبلیغ و دعوت کا دور ہے جس کا اصلی کام یہ ہے کہ لوگوں میں کفر و ایمان اور اسلام و جاہلیت کا امتیاز پیدا ہو جب یہ امتیاز پیدا ہو جاتا ہے یا وہ شرائط پورے ہو جاتے ہیں جو یہ امتیاز پیدا کرنے کے لیے ضروری ہیں تب وہ وقت آتا ہے کہ ان لوگوں کے کفر کا فیصلہ کیا جائے جو اپنے کفر پر اڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح کا امتیاز رکھنے والی صالح اور با اختیار جماعت ہی کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ کافروں کی تکفیر کرے اور اسی طرح کی جماعت ہی کا یہ منصب بھی ہے کہ وہ تکفیر کے ذریعہ سے اپنے اندر کے ان لوگوں کو چھانٹ کر الگ کرتی رہے جو اس کے اصولوں سے بغاوت کریں۔ آج جبکہ اس طرح کی صالح اور با اقتدار جماعت کوئی موجود نہیں ہے اور نہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا شرعی نظام قائم ہے کسی شخص کے لیے یہ بات جائز نہیں ہو سکتی ہے کہ وہ کسی کی تکفیر کرے۔ آج جو لوگ دین کی کوئی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں ان کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں میں کفر و اسلام کی معرفت پیدا کریں تاکہ وہ صالح اور با اقتدار جماعت وجود میں آئے جو لوگوں کو اسلام کی راہ پر قائم رکھ سکے۔ اور یہی طریقہ آج مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو کفر سے بچانے کا ہے نہ کہ وہ طریقہ جو عام طور پر ہمارے علما نے اختیار کر رکھا ہے۔ اور جس کو غلط فہمی سے مسلمانوں کو کفر سے بچانے کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے حالانکہ وہ اس دور میں کفر سے بچانے میں معین ہی ہے اور نہ کسی با اقتدار اور صالح جماعت کے سوا کسی کو اس کے اختیار کرنے کا حق ہی ہے۔

الہ آباد کو روانگی :- امیر جماعت اور مرکز کے رفقاء ۲ اپریل کو لاہور سے بذریعہ ہوڑہ ایکسپریس ساڑھے نو بجے رات کو روانہ ہوں گے اور لکھنؤ اور بریلی کے راستے ۴ اپریل صبح سویرے الہ آباد پہنچ جائیں گے۔

لاہور سے الہ آباد تک آمد و رفت کا کرایہ تقریباً تیس روپے ہوں گے۔

ذی قعدہ ۱۳۶۳ھ